شورش کاشمیری۔ایک عہد،ایک اسلوب!

محمد الیاس میراں پوری

شورش کاشمیری کا نام شعروادب اور صحافت وخطابت کی دنیا میں کسی تعارف کامحتاج نہیں۔وہ بلاشبہ عظیم الشان خطیب، بے مثال صحافی، خوبصورت نثّار اور مزاحمتی شاعر تھے۔انھوں نے ایک طرف شاعرانہ ولولوں سے بھری وادیاں خوش سلیقگی سے قطع کیں تو دوسری طرف قید وبند کے مرحلے ہمت وپامردی سے طے کیے۔''گفتنی ناگفتنی''، ''چہ قلندرانہ گفتم'' اور ''الجہاد والجہاد'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔اس کے علاوہ شورش کا بہت سا کلام ''چٹان'' میں بھی شائع ہوتا رہا جسے بعد میں ''کلیاتِ شورش کاشمیری'' کے نام سے یکجا کردیا گیا۔

شورش کاشمیری نے بیک وقت مولانا ابوالکلام آزاد، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، ظفرعلی خان اور چودھری افضل حق ایسی نابغہ روزگار شخصیات سے کسبِ فیض کیا اور وہ تمام عمر ان عظیم ہستیوں کے ممنون اوران کے افکار کے نقیب ومنادر ہے۔ ان کی تحریر میں ابوالکلام آزاد کا شکوہ، خطابت میں سید عطاء اللہ شاہ بخاری کا ولولہ، سیاسی فکر وتدبر میں چودھری افضل حق کی بصیرت اور صحافت میں ظفرعلی خان کی حق گوئی وحریت کیشی جھلکتی ہے۔

شورش کاشمیری کی شاعری دارورسن اور مزاحمت کا استعارہ ہے۔انھوں نے اپنی جوانی کے خوبصورت اور ولولہ انگیز کم وبیش دس سال قیدِ قفس میں کاٹے۔وہ خود کہتے ہیں:

رہا ہوں قیدِ مشقت میں دس برس شورش
ہر ایک حلقۂ زنجیر پا سے کھیلا ہوں

شورش قیدِ افرنگ کاٹ کر آنے والے ''شورش پسندوں'' کو ایک نئی اور انوکھی راہ دکھا گئے۔انھوں نے اپنی قید کے ایام مایوسی اور گھبراہٹ میں نہیں گزارے بلکہ زندہ دلی اور بہادری سے کاٹے۔انھوں نے اپنی زنداں کی یادوں کو ''پس دیوارِ زنداں'' میں متشکل کر کے حبسیاتی ادب میں اضافہ کرتے ہوئے مسعود سعد سلمان کی روایت کو آگے بڑھایا۔ (مسعود سعد سلمان نے تمام عمر زنداں میں گزار کر زندانی شاعری تخلیق کی۔اگر ان کا دیوان دستیاب ہوجائے تو ہم انھیں اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر کہہ سکتے ہیں)۔جیل کے حالات وواقعات، قیدیوں پر گزرنے والی صعوبتیں اور قیامتیں دل دہلاتی اور رونگٹے کھڑے کردیتی ہیں۔دلکش مرقع نگاری، زبان وبیان، اسلوب اور مواد کے اعتبار سے ''پس دیوارِ زنداں''

ادبی دنیا میں اپنی الگ پہچان اور انفرادیت رکھتی ہے۔

خروشِ نعرۂ پیکار لے کے آیا ہوں
حکایتِ رسن و دار لے کے آیا ہوں

شورش کے بقول سیاست کے پہلو میں دل نہیں ہوتا۔ انھوں نے اس وقت خارزارِ سیاست میں قدم رکھا تھا جب برطانوی سامراج کا سورج نصف النہار پر تھا۔ انقلاب کا نعرہ لگانا سزائے موت کے مترادف اور آزادی کا حصول دیوانے کا خواب سمجھا جاتا تھا۔ حریت وحمیت کے متوالوں کو سربازار پھانسی پر لٹکا دیا جاتا تھا۔ اظہارِ حق اور آزادیٔ اظہار پر پابندی کو لازم وملزوم سمجھا جاتا تھا۔ تب شورش نے کم سنی میں سیاست شروع کی تو میدانِ سیاست کے بڑے بڑے بزرجمہروں کے منہ کھلے رہ گئے۔ شورش کو اس بات کی قطعاً پروا نہیں تھی کہ اس کی زبان سے نکلا ہوا ایک ایک حرف منافقوں کے دلوں میں ترازو ہوتا ہے۔ وہ بے باکانہ، بے نیازانہ بلکہ ''شاہبازانہ'' پرواز کرتے رہے:

جب سیاست میں قدم رکھا تھا　　　ہم نے اس وقت سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں
خان زادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں　　　سرفروشوں کے لیے دار و رسن قائم تھے
خونِ احرار میں ڈوبی ہوئی شمشیریں تھیں　　　بے گناہوں کا لہو عام تھا بازاروں میں

شورش کاشمیری کا خمیر وطن سے بے پایاں محبت اور خلوص وللّٰہیت سے اٹھایا گیا تھا۔ ان کا سلسلہ حریت تحریک ولی اللّٰہی سے ملتا ہے۔ جس سلسلے کے مجاہدین سید احمد شہید اور شاہ اسماعیل شہید نے اپنی جانوں کا نذرانہ دے کر برصغیر کی آزادی کے لیے راہ ہموار کی۔

۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ میں انھوں نے یادگار نظمیں اور ملی نغمے لکھے جو بعد میں ''الجہاد والجہاد'' کے نام سے منصۂ شہود پر آئے۔ اپنے اخبار ''چٹان'' کو اس عظیم مقصد کے لیے وقف کر دیا۔ شورش نے ''چٹان'' کے اداریوں اور نظموں سے پاک فوج اور عوام الناس کے دلوں میں جذبہ جہاد اور وطن سے محبت کی آگ لگا دی۔ ان خدمات کے ''عوض'' ایوب حکومت نے انھیں گرفتاری کا تحفہ دیا تو شورش نے وطن سے محبت کرنے کے اس جرمِ بے گناہی کو ''تمغۂ خدمت'' کا نام دیا۔ (اس عنوان سے انھوں نے ایامِ اسیری کی یومیہ سرگزشت لکھی۔)

شورش کاشمیریؒ کے ہاں طنز کی گہری کاٹ ہے۔ وہ سیاسی رہنماؤں، مذہبی وڈیروں اور کوتاہ قامت ادیبوں کی منافقت دیکھتے ہوئے اپنے گہربار قلم سے شرر افشانی پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اگر ان کی شاعری کا غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ مزاحمتی شاعری کے زمرے میں آتی ہے۔ جو شخص بیک وقت ادبی بزرجمہروں، فقیہانِ شہر، سیاسی منافقوں اور زرد صحافت کے علمبرداروں سے برسرِ پیکار رہا ہو، اس کے قلم کی کاٹ اور جملوں کی ساخت وپرداخت کس درجہ خوب صورت اور دلکش ہوگی۔

ے کشکول لے کے شرع فروشی کا ہاتھ میں　　یہ ذکرِ وعظ ہے کہ نوائے گداگری
ے شورش فقیہہِ شہر کے چہرے کی آب و تاب　　قرآں کی آیتوں کے لہو کی دلیل ہے
ے ادیبوں کی زباں پر خوف کی سنگین مہریں ہیں　　صحافی جور و استبداد کے ہیں پردہ دار اب تک

شورش کے نزدیک انقلاب کے لیے بڑی قربانیوں کی ضرورت ہے۔اس کے لیے صعوبتیں، اور قید و بند کے مرحلے کوئی معنی نہیں رکھتے۔ انقلاب بے دریغ قربانیاں مانگتا ہے تب جا کر کہیں صحرا اور ریگستان، گل و گلزار میں متشکل ہوتے ہیں۔ اہل ہمت قربانیوں اور مصائب سے نہیں گھبراتے لیکن جب انقلاب کا راستہ ہموار ہوتا ہے تو چند سہل پسند اور تن آسان لوگ اس کے ثمرات پر قابض ہونے کے لیے بے چین و بے قرار نظر آتے ہیں۔ پھر یہی لوگ جاں نثاروں اور جانبازوں پر بے سر و پا نکتہ چینی اور لاحاصل تنقید کرتے ہیں۔اس صورت حال میں شورش نوجوانوں سے اس طرح مخاطب ہوتے ہیں:

ناقدو ! وقت کے افکار بدلنے کے لیے
میں نے مجبور زبانوں کو نوا بخشی ہے
کج کلاہوں کی رعونت کا اڑایا ہے مذاق
میں نے تاریخ کے چہرے کو ضیاء بخشی ہے

آج کی مقبول اصطلاح میں شورش بلا شبہ ایک عظیم مزاحمتی ادیب تھے۔ پاکستان کی تاریخ کی جڑیں، اس کے قیام کی تاریخ میں پیوست ہیں۔شورش نے بیسویں صدی کے ربع ثانی (اور ربع ثالث بھی) کے سب سے نازک اور سب سے ہنگامہ خیز دور کو اپنی کتابوں میں محفوظ کر دیا ہے۔ یہ جد و جہد اور مزاحمت کی سچی تصویریں ہیں۔ قلمی چہروں (”چہرے“) اور شخصی خاکوں (”نورتن“) پر مشتمل کتابوں میں شورش نے اپنے ہی اسلوب کو بدل بدل کر برتا ہے۔ پوری تخلیقی چابک دستی کے ساتھ۔شورش کو ابھی تک بالعموم ہمارے نصابی مہنتوں اور تنقیدی پنڈتوں کی آشیر واد نہیں ملی۔ بنیادی اور بڑی وجہ ان کا غیر ترقی پسند بلکہ اینٹی ترقی پسند ہونا ہے۔شورش کا سرمایۂ نظم و نثر ان کی زندگی میں بھی اور اس کے بعد سے آج تلک مقدار اور معیار کے دونوں اعتبارات سے ان کے ”مقبول“ اور ”مشہور“ معاصرین پر اپنا تفوق ثابت کرتا چلا آ رہا ہے۔ وجہ صرف یہ ہے کہ کھوکھلی نعرے بازی اور جذباتی استحصال پر مبنی پروپیگنڈائی تحریروں سے وقتی مقبولیت اور سستی شہرت حاصل کرنے والے لوگ ادیب نہیں ہوتے۔ ہو بھی نہیں سکتے۔اور نہ ہی ایسی نثر و نظم میں ادبیت، فن یا فکر سے جڑے کسی بڑے تخلیقی تجربے کی گنجائش ہوتی ہے۔

شورش کاشمیری کا نام تاریخ میں امر ہو چکا ہے۔ غیر جانبدار اور تعصب سے بالاتر تاریخ نویس جب بھی برعظیم پاک و ہند کی تاریخ لکھے گا تو شورش کا نام سنہرے حروف میں ہوگا:

تاریخ مرے نام کی تعظیم کرے گی
تاریخ کے اوراق میں آئندہ رہوں گا